آصف فرخی

آزاد کا اسلوبِ جنوں

(۱)

’’جنون بھی ایک طرح لازمۂ شاعری ہے۔ بعض محققوں کا قول ہے کہ دیوانہ اور عاشق اور شاعر کے خیالات بعض بعض مقامات پر متحد ہوجاتے ہیں۔ شاعر کو لازم ہے کہ سب طرف سے مطمئن اور خیالات سے منقطع ہوکر اسی کام میں متوجہ اور غرق ہوجائے اور یہ بات سوائے مجنوں کے یا عاشق کے کہ وہ برادر مجازی اس کا ہے، ہر ایک شخص سے نہیں ہوسکتی۔ مجنوں کو اپنے جنون اور عاشق کو معشوق کے سوا دوسرے سے کچھ غرض نہیں۔ خدا یہ نعمت سب کو نصیب کرے۔۔۔‘‘

محمد حسین آزاد، ’’نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات‘‘

(۲)

Who are those? Why sit they here in twilight?
Wherefore rock they, purgatorial shadows...
These are men whose minds the Dead have ravished.
Memory fingers in their hair of murders...
Carnage incomparable, and human squander
Rucked too thick for these men's extrication...
This their hands are plucking at each other...
Pawing us who dealt them war and madness
Wilfred Owen, 'Mental Cases'

دریا کے رواں پانی کی طرح جہاں دو دھارے ایک دوسرے سے آ کر ملتے ہیں اور پانی میں دو رنگ رلے ملے بھی نظر آتے ہیں اور الگ الگ بھی، محمد حسین آزاد کی طویل تصنیفی زندگی میں

دل چسپی اور جاذبیت اس وجہ سے بھی ہے کہ وہ اپنے معاصرین کے بقول ''آقائے اردو'' اور ''اردو کے بہترین انشاء پرداز'' تھے، اور ان پر ایک پورا دور نثر و نظم ختم ہو کر ایک نیا اور مختلف عہد شروع ہوا نظر آتا ہے بلکہ ہوش و گوش کی تصنیفات کے بعد انہوں نے عمر کا ایک پورا حصہ باقاعدہ اور تصدیق شدہ دیوانگی میں گزارا جس کے دوران اسی انہماک مگر ایک مختلف اسلوب کے ساتھ لکھنے لکھانے کا کام یوں جاری رکھا جس کی کوئی اور مثال اردو میں نہیں ملتی۔ محمد حسین آزاد کی تصنیفی زندگی یوں خود بخود دو علیحدہ اور غیر مساوی ادوار میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ان کے عالم ہوش کی کتابوں سے اردو ادب سے معمولی شُد بُد رکھنے والے قاری بھی واقف ہیں اور ان پر تنقید و تحسین کا طویل سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ ہوش کی سرحد سے گزرنے کے بعد بھی تالیف و تصنیف کا ان کا شغل جاری رہا اور اس عالم کی کتابیں اپنی جگہ اور ایک مختلف نوعیت کے مطالعے کا موضوع ہیں، جن کی معنویت مختلف ہے اور جن کا نثری اسلوب جداگانہ لحن و انداز کا حامل۔

مختلف مصادر میں کسی قدر اختلاف کے باوجود عام خیال یہ ہے کہ آزاد کا سنِ پیدائش جون ۱۸۳۰ء ہے، اس حساب سے ۱۸۸۵ء میں ان کی عمر ۵۵ سال کی رہی ہوگی جب ان کے سوانح نگاروں کے مطابق ان میں جنون کے آثار ناقابل تردید حد تک نمایاں ہو گئے۔ اس حساب سے اگر دیکھا جائے تو ۱۹۱۰ء میں اپنی وفات تک انہوں نے اپنی ستّر سالہ عمر طبیعی کے پچیس سال دیوانگی کے عالم میں گزارے۔ یہ ان کی پُختہ عمر کا خاصا بڑا حصہ ہے اور اس سے فوراً پہلے، وہ اسلوب و فکر میں پختگی کی جس منزل پر آن پہنچے تھے اس کا اثر ان کے عالم جنوں میں بھی کسی نہ کسی حد تک جاری رہا۔ دیوانگی کا یہ دورانیہ اور اس کے دوران ان کے قلم کی روانی ایک حیران کن امر بھی ہے اور ادبی معنویت سے مملو وقوعہ بھی۔ اس کے اسباب و نتائج بھی مختلف ہیں اور ادبی ثمرات بھی۔ روشن اور رواں اسلوب کے ساتھ ساتھ آزاد کی نثر کا یہ تاریک رُخ بھی موجود ہے اور یوں ان کی اہمیت اور معنویت کی دو الگ الگ جہتیں سامنے آتی ہیں۔ کسی سیارے کے تاریک رُخ کی طرح آزاد کی اس دوسری جہت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا محض اس وجہ سے کہ ہم اپنی رصد گاہوں سے اس کا مفصل جائزہ نہیں لے سکتے۔ تاریکی میں ڈوبا ہوا اور مختلف النوع جغرافیائی کیفیت کی حامل یہ اقلیم اپنے طور پر پکارتی ہے اور بلاتی ہے کہ چلے آؤ، ادھر بھی رُخ کرو، یوں بھی دیکھو۔

نیتشے نے لکھا ہے کہ جو پاتال میں دیر تک جھانک کر دیکھ لیتا ہے وہ پھر پاتال کا حصہ بن جاتا ہے۔ پاتال کی جھلک دکھانے کے لیے بلاوا دینے اور پھر پاتال کا جزو بنا دینے کی چکرا دینے

والی یہ طاقت، محمد حسین آزاد کے علاوہ کسی اور نثر نگار میں نظر نہیں آتی۔ وہ اپنے انداز جنوں کو نثر میں ڈھال لیتے ہیں اور ان کی دیوانگی میں بھی معنی ہیں۔ شیکسپیئر کے بقول،

There is a method in his madness

دیوانگی کے اس اسلوب کی مجھے بھی تلاش ہے اور اس کا ایک انوکھا امکان محمد حسین آزاد کے ہاں نظر آتا ہے اور اس کی نشان دہی کے لیے ان کے سوانح پر بھی نظر ڈالنا ہوگی اور ان کی تصانیف پر بھی۔

آزاد کے سوانح نگار ۱۸۸۵ء کو خطِ فاصل قرار دے کر ان کی دیوانگی کو امرِ واقعہ ثابت کردیتے ہیں۔ چناں چہ ڈاکٹر اسلم فرخی نے اس موضوع پر سب سے زیادہ مبسوط کتاب ''محمد حسین آزاد: حیات اور تصانیف'' کی جلد اول کے باب ''آزاد عالم جنون میں'' کا آغاز یوں کیا ہے:

> ''۱۸۸۵ء میں یا اس سے کچھ قبل آزاد اپنی لڑکی کی وفات سے اتنے متاثر ہوئے تھے کہ ہوش مندوں کو جنون کا شبہ گزرا تھا لیکن یہ کیفیت عارضی تھی، سیر و سیاحت اور تصنیف و تالیف کی مصروفیات نے اس کے اثرات بہت کم کردیے تھے، اثرات کم ضرور ہوگئے تھے لیکن ختم نہیں ہوئے تھے اور موقع پاتے ہی اس شدت کے ساتھ رونما ہوئے کہ آزاد کو پھر ان سے نجات نہ مل سکی۔۔۔''

اب اس نوع کا بیان بہت سے سوال اٹھاتا ہے جن کا تشفی بخش جواب فراہم نہیں کرسکتا۔ تاہم اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ دیوانگی کا عمل بتدریج بڑھنے والا سلسلہ تھا۔ عین ممکن ہے کہ بیٹی کی موت کے صدمے (bereavement) نے اس کو آج کی اصطلاح میں بندوق کی لبلبی دبا دی ہو (trigger-off) یا ایک آہستہ ردعمل کی لے کو یک دم تیز کردیا ہو۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ بھی قیاس آرائیاں ہیں اور اس انداز کی قیاس آرائیوں سے پرہیز لازم۔

لیکن اس معاملے میں سوانحی تفصیلات سے زیادہ قیاس آرائیاں ملتی ہیں، خاص طور پر جب سوانح نگار اس دیوانگی کا سبب بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد صادق نے اس دیوانگی کی جڑ، ''دیوانِ ذوق'' کی ترتیب میں آزاد کی غیر معمولی محنت و انہماک میں جا کر پکڑی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

> ''آزاد کی دیوانگی کا راز دیوانِ ذوق کی ترتیب میں مضمر ہے۔۔۔''

''رازِ دیوانگی'' پا لینے کی اس کوشش سے ڈاکٹر اسلم فرخی نے جزوی اتفاق کیا ہے۔ ان کے نزدیک یہ ممکن ہوسکتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ دوسرے عوامل بھی کارفرما رہے ہوں گے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''یہ خیال کسی حد تک صحیح ہوسکتا ہے لیکن اسے آزاد کی دیوانگی کا واحد سبب قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ بات اپنی جگہ پر بالکل درست ہے کہ دیوانِ ذوق کی ترتیب میں آزاد نے غیر معمولی کاوش اور محنت سے کام لیا اور اس غیر معمولی محنت کی وجہ سے ان کے ذہن پر بُرا اثر پڑا۔ لیکن دیوانگی کی ابتدا پہلے ہی ہوچکی تھی۔ دوسرا حملہ پہلے حملے کی ایک شدید شکل تھا، نیا اور انوکھا حملہ نہیں تھا۔۔۔''

پہلے حملے اور دوسرے حملے کی تفصیلی وضاحت انہوں نے نہیں کی لیکن وہ یہ ضرور لکھتے ہیں:

''اسبابِ جنون کا تجزیہ کرنے کے لیے ہمیں آزاد کی پوری زندگی پر نظر ڈالنا پڑے گی۔۔۔''

وہ ان ممکنہ اسباب کی نشان دہی کرنے لگتے ہیں تو اس کے محیط میں آزاد کی تقریباً پوری زندگی آجاتی ہے۔ نوعمری میں آزاد کی محرومیوں کی تفصیل انہوں نے کتاب کے ابتدائی حصے میں رقم کی ہے، لیکن یہاں انہوں نے ۱۸۵۷ء سے ان واقعات کو ترتیب وار شمار کیا ہے:

> ''۱۸۵۷ء سے ۱۸۸۵ء تک کے پورے عرصے میں آزاد مطمئن، مسرور اور فکروں سے خالی نظر نہیں آتے۔ ۱۸۵۷ء نے انہیں شدید ذہنی، روحانی اور مادّی اضطراب میں مبتلا کردیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے سانحات ایسے تکلیف دہ تھے کہ آزاد زندگی بھر ان کے ماتم دار رہے۔ باپ کا قتل ہوجانا۔ شیرخوار بچی کا توپ کے دھماکے سے دم توڑ دینا۔ عزیزوں کی جدائی۔ بایہ پیمائی۔ غریب الوطنی۔ یہ سب باتیں ایسی نہیں کہ کوئی انسان بھی انہیں بُھلا دے۔۔۔''

مگر مشکل یہ ہے کہ آزاد جن مسائل کا شکار رہے، ۱۸۵۷ء ان کا نقطۂ انتہا نہیں ہے۔ یہ سلسلہ اس سے آگے بھی جاری رہا۔ محکمہ جاری محنت، ملازمت میں مخالفت، کتابوں پر معاندانہ تبصرے اور اولاد کا صدمہ۔۔۔ غرضیکہ ڈاکٹر صاحب نے پوری ایک فہرست گنوا دی ہے اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

''ان سب باتوں نے مل جل کر ان کے ذہن پر بڑا بُرا اثر ڈالا اور آخرکار اپنی چہیتی بیٹی

کے انتقال کی خبر سُن کر ان کا دماغ ماؤف ہوگیا۔ یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ آزاد کی دیوانگی کا سبب یہی صدمات تھے۔ مسلسل اور متواتر صدموں، مایوسیوں اور ناکامیوں نے اُنہیں مجنوں بنا کر چھوڑا۔ صدموں کی یورش اور غیر معمولی محنت، دماغ آخر کہاں تک ساتھ دیتا۔۔۔‘‘

ظاہر ہے ایسی کوئی فہرست مکمل نہیں ہوسکتی اور نہ کوئی پوری طرح اندازہ لگا سکتا ہے کہ کس واقعے سے ذہن پر کیا اثر مرتب ہوا۔ آزاد کے سوانح نگاروں نے ان کی زندگی کے واقعات اور صدمات میں دیوانگی کے اسباب تلاش کرنے اور نشان زد کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اسباب کی تلاش بے سود ہے۔ دیوانگی اپنا سبب خود ہے۔ اس کو ڈھونڈنے کے لیے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں۔ اسباب کی نشان دہی کے بجائے میں چاہتا ہوں کہ آزاد کی دیوانگی کی مظہریات (phenomenology) اور اس کے وجودی مرکز کو دیکھا جائے۔ آزاد کے زمانے سے لے کر اب تک جدید نفسیات اور نفسیاتِ مرضی کی ترقی جس نہج اور اصولوں پر ہوئی ہے، ان سے واضح ہوچکا ہے کہ دیوانگی اسباب کی پابند نہیں ہوتی، بظاہر معمولی اسباب یا بنا اسباب کے بھی لاحق ہوسکتی ہے اور نہ اسے صدمات کے رکارڈ سے ناپا اور پرکھا جاسکتا ہے۔ اپنے زمانے کے مشہور ماہرِ نفسیات اور مصنف R.D.Laing نے اپنی کتاب The Politics of Expenence میں برملا طور پر لکھا ہے:

> Behind every mad person, there is a maddening situation.

ممکن ہے کہ ثقہ حضرات Laing کے نام پر ناک بھوں چڑھائیں کہ اپنے وقت میں تحلیلِ نفسی کا پیشوا معلوم ہونے والا یہ مصنف اب اتنا موقر نہیں رہا۔ لیکن آزاد کے سلسلے میں اس کی بات کو تقویت فتح محمد ملک کے دل چسپ مضمون ’’آزاد کا طرزِ احساس‘‘ سے ملتی ہے جس میں ۱۸۵۷ء کے واقعات کو آزاد کی سائیکی کے دولخت ہوجانے سے منسلک کرکے دیکھا گیا ہے کہ ’’ہے نا پاگل ہوجانے والی بات!‘‘ واقعی ہے تو سہی، مگر کون سی بات؟ ۱۸۵۷ء کے غدر کا برپا کیا ہوا ثقافتی و تہذیبی انقطاع، جو شخصی و انفرادی سطح پر بھی اپنے نتائج چھوڑے بغیر نہیں رہ سکتا تھا، یا نقادوں کے اندازے؟ ۱۸۵۷ء کے واقعات آزاد کے لیے الم ناک تھے مگر ان واقعات کے بارے میں ان کا روّیہ کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔ وہ ان تبدیلیوں سے خود کو ڈھالنے کی کوشش بھی کرتے نظر آتے ہیں اور

اسے ان کے مزاج کی resilience قرار دیا جاسکتا ہے یا پھر الم انگیز واقعات کے شعوری و لاشعوری sublimation کا وہ سلسلہ جو شخصیت کی تعمیر میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ اس طور شخصیت کی تعمیر میں دراڑیں پڑ گئیں اور یوں خرابی کی صورت پیدا ہوگئی۔ لیکن یہ بھی اندازے ہیں، یقین سے کوئی بات اگر کہی جاسکتی ہے تو وہ آزاد کا جنون میں مبتلا ہونا ہے۔ یہ کیفیت جس فن کار پر گزرتی ہے، وہی اسے جان سکتا ہے۔ رہ گئے ہم ایسے نقاد اور ان کے دور بیٹھے کے اندازے تو اس پر مجھے امریکی شاعر و ناقد جان کرو رین سم کا پرانا مضمون یاد آنے لگتا ہے — نقاد پاگل کیوں نہیں ہوتے؟ why critics don't go mad۔ پاگل ہونے کا راستہ بھی کھلتا ہے تو آزاد جیسے فن کار کے لیے۔

آزاد کی دیوانگی کے عالم اور اس دوران سرزد ہونے والی تصانیف کو ان کی تخلیقی و تصنیفی زندگی میں انقطاع (disruption) کے بجائے ایک اور جہت میں اس کے تسلسل کے طور پر دیکھنا بے سود نہ ہوگا۔ ان کی تخلیقی زندگی کا ایک اور مرحلہ جس میں اظہار و بیان کی کاوش پہلے کی طرح موجود ہے لیکن اظہار کے پیرائے مختلف۔ اور ان کے مختلف ہونے میں ان کی معنویت پنہاں ہے، بدلی ہوئی معنویت جو مکمل طور پر داخلی کیفیت کے تابع نہیں ہے اور زبان کی کارفرمائی کے توسط سے قائم ہوتی ہے۔ یعنی زبان و اسلوب کا وہ منصب جو آزاد کی عالم ہوش کی تصانیف کا خاصہ تھا، ان تحریروں میں بھی فوقیت رکھتا ہے۔ اس کو یوں بھی دیکھا جاسکتا ہے کہ ادیب کی شخصیت منہا ہوجاتی ہے، اس کی دماغی حالت بھی درمیان سے ہٹ جاتی ہے اور نثری اسلوب پوری طاقت کے ساتھ کلام کرتا ہے۔ لیکن میں اس معاملے کو یوں دیکھنا چاہتا ہوں کہ نثری اسلوب ایک حساس پرچھائیں کی طرح حرکت کرتا ہے اور ذہن کی بھٹکتی ہوئی لرزشوں کو اپنے اندر سمو کر ایسی تصویر خلق کرتا ہے جس میں اسلوب، دیوانگی کی ’’موسیقی‘‘ کو اجاگر کرتی ہے۔ یہ سازِ جنوں بھی آزاد کا اعجاز ہے، آخری اور انتہائی کمال۔ اس بھٹکی ہوئی منزل پر آزاد اپنی مثال آپ ہیں۔ ہوش و خرد کی قربانی دیے بغیر کوئی دوسرا ادیب ان کا ہم سر ہو بھی نہیں سکتا تھا اور ہوش و خرد تو بہت سے لکھنے والوں کے ہاں رُخصت ہوتا ہے، نثر کا لحن بھلا کس کے ہاں اس درجہ پُرقوّت ہوسکتا ہے کہ جنون کے پردۂ ظلمات میں بھی نمایاں رہے۔ دیوانگی کے عالم میں بھی آزاد بہرحال آزاد ہیں۔

ان ہی ’’دیدہ وشنیدہ‘‘ آزاد کو ہم ہوش کی حد سے گزر کر دیوانگی کی کیفیت میں داخل ہوتے

ہوئے دیکھ سکتے ہیں مگر یہ تصویر وقت کے ساتھ دھندلا گئی ہے اور اس کے خدوخال پوری طرح صاف اور واضح نہیں رہے۔ ''پاگل کردینے والی بات'' جو پروفیسر فتح محمد ملک نے بیان کی ہے، اس کی بنیاد آزاد کا لاہور سے دلّی پیدل سفر کے لیے نکل پڑنا، یوں ہی بغیر اطلاع کے وارد ہوجانا، نذیر احمد کا بدک جانا اور مولوی ذکاء اللہ کا آزاد سے حجامت بنوا لینا جیسے واقعات پر قائم کی ہے۔ اسی طرح کے اور واقعات آزاد کے شاگردوں اور قریبی معاصرین نے قلم بند کرکے محفوظ کردیے ہیں۔ پڑھانے کے دوران ربط اور تسلسل کی کمی جو پہلے پہل کالج کے شاگردوں کے مشاہدے میں آئی۔ روحانی تصرفات سے دل چسپی اور دعوے۔ غیر موجود شخصیات سے مکالمے۔ گھر والوں اور بعض ملنے والوں کے سامنے بے محابا گالم گلوچ۔ بعض لوگوں کو پہچاننے میں دھوکا، بلکہ کبھی مغائرت اور کبھی ازحد بڑھا ہوا اخلاص۔ بے موقع فرمائشیں۔ خراب حلیہ اور اپنے حال پر بے توجہی۔ گھر سے یوں ہی نکل پڑنا اور کہیں کا کہیں پہنچ جانا اور اس کیفیت کے دوران ہوش کے ایسے وقفے (lucid intervals) کہ دیکھنے والوں کو پچھلی باتیں مشتبہ معلوم ہونے لگیں اور آخر آخر حال سے بے حال ہوکر بربادی وخرابی (degeneration) کا مکمل مرقع بن کر رہ جانا— اس طرح کی کئی نشانیاں بیان کی گئی ہیں۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نے ان میں سے چند ایک واقعات کو اپنی مؤقر تالیف میں درج کیا ہے لیکن اس معاصر دستاویزی شہادت کو محدود رکھتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اس قسم کے اور بہت سے واقعات مختلف لوگوں نے لکھے ہیں، جن کو جمع کیا جائے تو ایک مختصر سی کتاب تیار ہوسکتی ہے، ہم طوالت کے خوف سے انہیں یہاں درج نہیں کرسکتے۔۔۔''

بہرحال طول کلامی کا خطرہ مول لینا اور ایسی کتاب کا تیار کرنا اس ضمن میں مفید ثابت ہوتا۔ جن معاصرین نے اس دور میں آزاد کی مرقع کشی کی ہے انہوں نے واقعاتی احوال پر سارا زور صرف کیا ہے، وہ بھی افسوس و ہم دردی یا قدرے احساسِ تفنّن کے ساتھ۔ ان واقعاتی شہادتوں کا احوال ادھورا ہے اور آزاد کی تشخیص مرض کے لیے نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوسکتا۔

اس ضمن میں جو دستاویز مکمل سند فراہم کرسکتی تھی وہ ملازمت سے برطرفی اور عدالتی حکم کی دستاویز ہے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نے اپنی کتاب میں اس کا حوالہ درج کیا ہے:

> ''ضلع لاہور کے جج W.A.Harris ۱۸۵۸ء کی دفعہ ۳۵ کے تحت اپنے حکم مورخہ ۳رمئی ۱۸۹۰ء کے ذریعے سے آزاد کو دیوانہ قرار دے چکے تھے۔ آغا محمد ابراہیم ان کی جائیداد کے متولی اور سردار نریندر سنگھ آنریری اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لاہور ان کی ذات کے نگراں مقرر ہوئے

تھے۔۔۔''

اس عدالتی حکم نامے سے آزاد کی مکمل کیفیت ظاہر ہوسکتی تھی جو آج کسی clinical تشخیص میں ہماری رہ نمائی کرتی لیکن اس دستاویز کا محض حوالہ ہی موجود ہے، اس کی نقل نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے ''مقبوضہ آغا محمد باقر صاحب'' مگر اب کہیں اس کا سراغ نہیں ملتا۔ ورنہ اس معاملے میں جو کلیدی دستاویز ثابت ہوسکتی تھی افسوس کہ آزاد کی زندگی کے یہ آثار بے توجہی کی نذر ہوگئے۔

عدالتی اور طبّی شہادتوں کی عدم دست یابی کے باعث ہم صرف ان محولہ بالا واقعاتی بیانات کو بنیاد بنانے پر مجبور ہیں، جن کی افادیت مشکوک نہیں مگر بہرحال محدود ہے۔ ان واقعات سے جن علامات کی نشان دہی ہوتی ہے، وہ اس طرح ہیں:

(۱) بے خوابی اور بدخوابی (مولوی خلیل الرحمن)

(۲) مراق بڑھتا گیا (مولوی خلیل الرحمن)

(۳) سب کے سامنے بیوی سے بدکلامی (مولوی خلیل الرحمن)

(۴) روحانی جذبات کا غلبہ (مولوی ممتاز علی)

(۵) ''ردّی حالت'' (مولوی ممتاز علی)

(۶) ''بعض اوقات بالکل آپے سے باہر ہوکر خدا جانے کیا کیا سنا دیتے'' (آغا محمد طاہر)

(۷) پیدل سفر، لاہور سے دہلی اور علی گڑھ

(۸) ''گفتگو کبھی سلجھی ہوئی اور کبھی الجھی ہوئی، یہ خلل دماغ کا نتیجہ تھا۔۔۔'' (مولوی عبدالرزاق کان پوری)

(۹) لوگوں کو پہچاننے میں بعض مرتبہ اشتباہ (مختلف)

(۱۰) عملیات میں بڑھتی دل چسپی (مولوی ممتاز علی و دیگر)

تصانیف کی داخلی شہادت ان کے علاوہ ہے۔ ان بیانات کی روشنی میں یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ محمد حسین آزاد کی یہ کیفیت Schizo phrenia کی کسی خاص قسم کا نتیجہ ہوگی۔ اس خیال کو تقویت تحریری شہادت سے یوں ملتی ہے کہ ان تحریروں میں آزاد نے بعض مرتبہ اپنی زبوں حالی کا بیان کیا ہے لیکن اپنے بارے میں کسی ایسی بصیرت (insight) کے بغیر جو اس طرح کی کلینکل تفتیش میں کلیدی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے بجائے روحانی تصرفات کے دعوے اور کائنات گیر

تخلیقی قوت کا اظہار کیا ہے جو حقیقت سے مطابقت نہ رکھتے ہوئے اس مرض کی خاص نشانی ہے۔ تحریروں کے دورانیے میں بھی منطقی استدلال کے بجائے آڑے ترچھے خیالات کی نموداری ہے جو شطرنج کے گھوڑے کی سی چال چلتے ہوئے اس مرض کی ایک اور نشانی معلوم ہوتے ہیں۔ اس معاملے میں ان کی تصنیفات بھی مرض کی نشانی فراہم کرتی ہیں اور schizo phrenic writing کی مثال ہیں، جس کی درجہ بندی ماہرینِ نفسیات نے تفصیل کے ساتھ کر رکھی ہے۔

آزاد کے عالمِ جنوں کے احوال دل چسپ بھی ہیں اور عبرت خیز بھی۔ دل چسپ میں نے یوں کہا کہ ان بیانات میں آاد ایک کردار کی طرح اٹھتے بیٹھتے اور حرکات وسکنات کے دوران نظر آتے ہیں جس سے اس طرح کی تصویر سی آنکھوں میں کھنچ جاتی ہے جیسے اردو کے سربرآوردہ ادیبوں کے قلمی مرقع خود آزاد نے کئی نسلوں کے پڑھنے والوں کے لیے پیش کیے ہیں۔ اسی لیے یہ عجیب ستم ظریفی معلوم ہوتی ہے کہ ایسی چلتی پھرتی تصویر بن جانے کی صلاحیت آزاد میں خود کس درجے کی تھی۔ اس دل چسپی کے باوجود تشخیصی نقطۂ نظر سے معنی خیز وہ بیانات ہیں جن میں تصویری انداز کے بجائے علامات مرض کی نشان دہی ممکن ہو۔ چناں چہ ڈاکٹر محمد صادق نے مولوی خلیل الرحمن کے خط کا اقتباس درج کیا ہے:

> ''آزاد کی دیوانگی عجیب قسم کی تھی، پانچ منٹ دس منٹ بعض اوقات آدھا پونا گھنٹہ بہت اچھی طرح باتیں کر رہے ہیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ دماغ پر کوئی اثر نہیں، حافظہ اور دل اچھا ہے۔ یکا یک دیوانگی شروع ہوگئی، لوگ دھوکے میں رہ جاتے اور حیران ہوتے تھے۔۔۔''

یہ بیان بہت واضح ہے، مگر اس کا مآخذ ایک خط ہے جس سے خاص طور پر وقت کے تعین میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ اس ضمن میں میرا اندازہ ہے کہ ڈاکٹر محمد صادق سے یہ تسامح ہوا ہے کہ انہوں نے جس کیفیت کو آزاد کا عالم دیوانگی قرار دیا ہے، اسے جامد اور یکساں نوعیت کا حامل سمجھ لیا ہے۔ اس طرح متواتر تنزل (detoriation) اور مرض کی بتدریج بڑھتی ہوئی کیفیات کا جائزہ مرتب نہیں کیا گیا جس سے ان کے بارے میں کوئی حتمی نتیجہ اخذ کرنے میں سہولت ہوتی۔

آزاد کے عالمِ جنوں کا جہانِ معنی مختلف ہے۔ اس میں آزاد کے ساتھ ساتھ ہم ایسی جہات سے روشناس ہوتے ہیں جن کا سراغ بھی ان کی عالم ہوش کی تصانیف سے کم کم ملتا ہے۔ روحانیات

کی طرف حد سے بڑھتا ہوا شغف (مکاشفات اور فلسفۂ الٰہیات) اس کیفیت کا سبب بھی ہے اور اس کا نتیجہ بھی۔ بسا اوقات روحانیات کا یہ تصرف ایک ایسا پردہ بھی بن گیا ہے جس میں جنون کے آثار چھپ گئے ہیں۔ عالم جنوں کی کئی تصانیف میں آزاد اپنے آپ کو ‘‘پروفیسر آزاد’’ کے نام سے مخاطب کرتے ہیں اور مکالمے و مجادلے کے مراحل سے گزرنے لگتے ہیں۔ اس ڈرامائی انداز کی ابتداء کا سراغ ‘‘دربار اکبری’’ سے ملتا ہے جہاں بعض مقامات پر اکبر کے دور کی جدلیات کے دوران اپنے مشاہدے کو جگہ دیتے ہیں۔ یہ محض اسلوب کی تکنیک نہیں، ایک نفسیاتی معاملہ بن کر اس وقت اور بھی نمایاں طور پر سامنے آنے لگتا ہے جب آزاد اپنے لیے شخصِ سوم مفرد کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے اپنے لیے ایک Personna خلق کر لیتے ہیں۔ اسی طرح کا ایک نفسیاتی پرسونا مہاراجہ جے چند کی صورت میں بھی سامنے آتا ہے جب وہ اپنے تاریخی تناظر سے منقطع ہو کر کسی شہابِ ثاقب کی طرح آزاد کی منتشر ذہنی کہکشاں میں نمودار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی کی رائے میں آزاد جب راجہ جے چند کا نام لیتے ہیں تو وہ اپنے آپ کو اس کا اوتار سمجھتے ہیں۔ اس سے زیادہ حیرت انگیز و معنی خیز پروفیسر آزاد کا خود اختیار کردہ یہ پرسونا ہے جس میں وہ اپنے آپ کو نظم دنیا کا اہم حصہ بلکہ تخلیقِ کائنات کا حامل اور شریک سمجھنے لگتے ہیں اور نثر کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگتا ہے جہاں جانور اپنی اپنی صورتوں میں تخلیق کیے جا رہے ہیں اور درجے تفویض کیے جا رہے ہیں۔ اس انداز کو آزاد کا روحانی تصرف سمجھیے یا نہ سمجھیے، میں تو اسے ان کی نثر کا اعجاز سمجھتا ہوں، جو اپنے آپ میں اس قدر رچا ہوا ہے کہ محتاجِ معنی بھی نہیں۔

شخصیت کی طرح بعض واقعات بھی ایک معکوس صورت میں ان تصانیف میں نظر آتے ہیں۔ آزاد نے اپنی زندگی کے کئی واقعات، خاص طور پر ملازمت کے مسائل کا ذکر ایک oblique انداز میں کیا ہے مگر سب سے زیادہ درد انگیز ۱۸۵۷ء کا وہ تذکرہ ہے جس کے رنگ دیوانگی کے بغیر ان کی تصانیف میں نمایاں نہیں ہوتے۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات جس طرح رونما ہوئے، اس سے آزاد کو ایک شدید دھچکا پہنچا اور ان کی زندگی کا oreintation بدل کر رہ گیا۔ آزاد کے بیش تر سوانح نگاروں نے ان واقعات کے صدمے کو ان کی ذہنی کیفیت میں اختلال کی بنیادی وجہ قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے مضمون ‘‘آزاد کا اسلوبِ فکر’’ میں ان واقعات کے اثر کو آزاد کی شخصیت میں پڑنے والی دراڑ کے طور پر دیکھا ہے؛ جو انگریز حکمرانوں کی ملازمت سے مفاہمت یا compromise کے باوجود اندر ہی اندر پروان چڑھتی رہی:

> ''فاتح (یعنی انگریز) کے ساتھ آزاد کا تعاون محض بالائی سطح تک محدود اور سراسر مصلحتِ وقت کے تابع تھا۔ مگر آزاد کے باطن نے فاتح کو ہرگز قبول نہیں کیا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو وقت کے سامنے جُھکنے کے ساتھ ساتھ اپنے ضمیر کو سُلا دینے میں خاصے مشاق ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آزاد کے اندر ایک کہرام سا برپا ہوگیا۔ ایک طرف وہ حکومت سے سمجھوتا کرنے پر مجبور تھے۔ دوسری طرف اپنے ضمیر کی آواز سے برسر پیکار ہوگئے تھے۔ چناں چہ بعد ازاں ان پر دیوانگی کی جو حالت طاری ہوئی، قیاس کہتا ہے کہ وہ دراصل شخصیت کے دو نیم ہونے ہی کی باعث تھی۔۔۔''

(مشمولہ ''؟؟ واحتساب'' ۱۹۶۸ئ)

اس کے اثرات کا اظہار چاہے جو شکل بھی اختیار کرے، اس میں کوئی شک نہیں کہ ۱۸۵۷ء کے واقعات کا آزاد پر نہایت گہرا اور دیرپا اثر ہوا اور وہ تاعمر ان کو فراموش نہیں کر سکے۔ مولوی خلیل الرحمن نے ان واقعات کے ذکر ہی پر آزاد کے ردعمل کو رکارڈ کیا ہے:

''ایام غدر کے مصائب کا طبیعت پر بہت ہی زیادہ اثر تھا۔ نہ پوچھیے میں نے صبح کی ہوا خوری یا شام کی فرصت میں بار بار چھیڑا اور اور انجام آنسوؤں پر ہوا۔۔۔''

(بحوالہ ڈاکٹر اسلم فرخی، محمد حسین آزاد، احوال و آثار)

آزاد کا یہ ردعمل ظاہر ہے کہ فطری معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ ردعمل ان کی گفتگو یا ذاتی encounter تک محدود رہتا ہے، ان کی تصانیف میں جگہ نہیں پاتا۔ چناں چہ ڈاکٹر اسلم فرخی نے نشان دہی کی ہے کہ آزاد نے اپنی زندگی کے اس ہنگامہ خیز دور سے متعلق کوئی بات وضاحت کے ساتھ نہیں لکھی۔ اس کے بعد وہ اس اغماض کی ممکنہ وجوہات کی نشان دہی بھی کرتے ہیں، جو ایک علیحدہ مطالعے کا موضوع ہیں اور اس ضمن میں ایک مفید مطالعہ رفاقت علی شاہد نے اپنے مقالے ''مولانا محمد حسین آزاد اور ۱۸۵۷ئ'' میں پیش کرتے ہوئے تعجب کا اظہار کیا ہے:

> ''حیرت انگیز امر یہ ہے کہ مولانا آزاد نے کافی مصائب اور رنج برداشت کرنے کے باوجود ۱۸۵۷ء کے دوران خود پر بیتنے والے حالات، واقعات اور خیالات کو تفصیل سے کہیں بیان نہیں کیا۔۔۔''

اس کے برخلاف رفاقت علی شاہد غالب کے روّیے کو قرار دیتے ہیں جنھوں نے اپنے نہ

صرف یہ کہ اپنے خطوط میں حوادث اور مسائل کو رقم کر دیتے ہیں بلکہ ''دستنبو'' میں تمام واقعات کو اس طرح لکھ ڈالتے ہیں جسے آج کا کوئی ادیب رپورتاژ یا روداد (chronicle) قرار دے سکتا ہے۔ میری دانست میں یہاں آزاد کے معاصر اور رفیق نذیر احمد کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے، جنہوں نے ۱۸۵۷ء کے بارے میں ''فاتح بیانیے'' کو فروغ دینے کی غرض سے ''مصائب غدر'' نامی کتاب کا ترجمہ کیا، جو غالباً ان کے لیے مفاہمت کی وہ صورت تھی جو سامنے آئی۔ علاوہ ازیں ''ابن الوقت'' میں غدر اور اس سے بڑھ کر اس کے ثقافتی مضمرات کو براہِ راست موضوع بنایا۔ یہ بات بہرحال محل نظر ہے کہ نذیر احمد سے زیادہ engaging معاملہ مجھے غالب کا لگتا ہے اور میں غدر کو نذیر احمد کی عینک سے نہیں، غالب کی آنکھوں سے دیکھنے میں ایک گونہ عافیت پاتا ہوں:

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

سماجی درہمی اور بحران کا سامنا اپنی افسردگی کے ساتھ کرنے کے معاملے میں غالب ہماری رگِ جاں سے قریب ہیں لیکن آزاد کی خاموشی ان کی زندگی کا تجزیہ کرنے والے تمام لوگوں کی طرح مجھے بھی ایک عقدۂ غور طلب معلوم ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی اسی سے منسلک معلوم ہوتی ہے کہ جب آزاد عقل و خرد کی سرحد عبور کر کے جنوں کی اقلیم میں داخل ہوئے تو وہ مفاہمت یا احتیاط جو ان کی خاموشی کا سبب بنی تھی، پیچھے رہ گئی اور غدر کے واقعات ایسا درد بن کر سامنے آئے جس کا مداوا نہیں ہو سکا تھا۔ عالم جنوں کی تصانیف میں ۱۸۵۷ء کے واقعات کا اتنا ذکر ہے کہ آغا سلمان باقر نے اپنی کتاب میں ایک علیحدہ باب اس عنوان سے قائم کیا ہے (''۱۸۵۷ء کے واقعات، وارفتگی کی تحریروں میں'') اور ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے بھی اپنے تفصیلی مقالے میں نشان دہی کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''۱۸۵۷ء کے واقعات آزاد کے غیر مطبوعہ رسائل میں موجود ہیں۔ بیش تر مقام پر مُنتشر تصاویر ہیں جن میں ربط پیدا کرنا مشکل ہے۔ لیکن ان سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ آزاد کے لاشعور میں یہ پُراذیت تصاویر عالمِ جنوں میں کس طرح ابھرتی ہیں۔۔۔''

(ڈاکٹر تبسم کاشمیری، آزاد کا عالم دیوانگی، اوراق، فروری مارچ ۱۹۸۱ئ)

میری دانست میں ان منتشر تصاویر کو معنی سے تہی قرار دینا دُرست نہ ہوگا کہ جہاں جہاں یہ منظر ابھر کر سامنے آیا ہے، یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس کا موجب ایسی تکلیف ہے جس کو فراموش نہیں کیا جاسکا اور آزاد کا حافظہ ذرا ذرا سی بات کو بھی کرب انگیز تفصیل کے ساتھ دُہرائے چلا جا رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہر برباد ہوگیا، گھر لُٹ گیا، باپ موت کے گھاٹ اتارے گئے اور آزاد بھی ہوش و خرد سے بے گانہ ہوئے مگر ان کی شخصیت کے کسی نہ کسی حصے میں غدر ایک unresolved تصادم کی طرح جاری ہے اور رہ رہ کر ٹیس بن کر اٹھتا ہے۔ بیان کی اس صورت تک آنے کے لیے انہیں دیوانہ بننا پڑا۔ آزاد کی یہ دیوانگی خود ایسا خوف ناک بیانیہ ہے کہ جس کا ذکر غدر کے کسی محضر نامے میں درج نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ تاریخ سے شروع ہوکر پھر تاریخ کی حدود سے اتنا ماورا ہوجاتی ہے کہ پھر دیوانگی ہی آپ اپنی تاریخ ہے۔ تاریخ کی وہ واحد صورت جو آزاد کے لیے ممکن رہ گئی تھی۔

عالم جنوں کی تصانیف میں یہ منتشر اور غیر مربوط (خارجی طور پر) بیانیہ بھی ۱۸۵۷ء کے واقعات پر آزاد کے اس ردعمل کا نیم تاریک دوسرا رُخ ہے جو اس سے پہلے کے دور میں ان کی خاموشی اور تحریر میں اس موضوع سے گریز سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ تضاد آزاد کی شخصیت کا ایک بنیادی Schism ہے لیکن اس کے باوجود میں یہ سمجھتا ہوں کہ ۱۸۵۷ء کا ذکر آتے ہی ہم سب ایک نوع کے اجتماعی اور تاخیر سے برآمد ہونے والی رومانویت کا شکار ہوجاتے ہیں جہاں ہر پرچھائیں اپنے حجم سے بڑی نظر آنے لگتی ہے۔ آزاد کی زندگی کے جُملہ مسائل اور بعد میں ظاہر ہونے والے ہر تضاد کو ۱۸۵۷ء کی اصطلاحوں میں بیان کرنا اور اس طرح حل کرنا ایک پُرسہولت ذریعہ فراہم کردیتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ آزاد نے بہت تکلیفیں سہہ لیں اور ایسے حالات سے گزرے جنہیں ہوش ربا قرار دیا جاسکتا ہے لیکن دیوانگی صرف و محض ۱۸۵۷ء کے واقعات سے گزرنے کے عوامل و نتائج میں سے ایک ہوسکتی ہے، صرف و محض اسی سے سلسلے وار ٹھہرانا مشکل ہے۔ ایک طرح کی تخفیف پسندانہ غلط فہمی (reductive fallacy) جس سے پرہیز آزاد کے جنوں جیسے پیچیدہ مظاہر کا ابتدائی جائزہ بھی لینے کے لیے امرِلازم ہے۔ دراصل آزاد کے عالم جنوں کی مظہریات (phenomenology) اپنے آپ سے نبردآزما ہونے کے لیے ہم سے ایسے تنقیدی آلات کا

تقاضہ کرتی ہیں جو ہم ابھی تک بہم نہیں پہنچا سکے ہیں اور جن کی غیر موجودگی میں یوں ہی بھٹکتے پھرتے ہیں۔ اس کے باوجود جن مہم جو تجزیہ نگاروں نے آزاد کی تخلیقی شخصیت کے اس منفرد حصے کے مطالعے کا ہمت کی ہے، ان میں خاص طور پر ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے مفصل مقالے کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے، جس میں وہ آزاد کی شخصیت میں ’’پرسونا کی شکست و ریخت‘‘ کے عمل کا ذکر کرتے ہیں اور عینی شواہد کے ساتھ ساتھ ان کی تصانیف کو بھی معرضِ گفتگو میں لاتے ہیں۔ لیکن انہوں نے اس قسم کا تجزیہ بھی ایک سے زیادہ مرتبہ دہراتے ہیں:

’’۱۸۵۷ء کے حادثات نے آزاد کے اعصابی خلیوں (nerue cells) کو شدید نقصان پہنچایا۔۔۔‘‘

ایک اور دل چسپ اور کئی اعتبار سے اہم مطالعہ آغا سلمان باقر کی مختصر کتاب ’’آزاد کا عالم وارفتگی‘‘ میں سامنے آتا ہے جس کی ایک اہمیت بعض غیر مطبوعہ مآخذ تک رسائی اور ان کا ذکر بھی ہے۔ آغا سلمان باقر آزاد کے اس دور کے لیے دیوانگی کے لفظ کو مسترد کرتے ہوئے اسے ’’وارفتگی‘‘ قرار دیتے ہیں۔ ’’وارفتگی‘‘ کا لفظ انہوں نے آغا محمد باقر کے اس بیان سے لیا ہے جہاں وہ اس کیفیت میں بھی پورے اہتمام کے ساتھ تصنیف و تالیف میں آزاد کی مشغولیت کا ذکر کرتے ہیں اور اسے ’’آزاد روی‘‘ سے جوڑ لیتے ہیں جو ڈاکٹر وزیر آغا کے مطابق آزاد کا تخلیقی مزاج تھا:

’’ان کی شخصیت کا غالب اور اہم ترین پہلو آزادی اور آوارہ خرامی کے رجحان سے متعلق تھا۔ بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ آزاد کی آزادہ روی ان کے مخصوص حالات کا نتیجہ تھی۔۔۔‘‘

(ڈاکٹر وزیر آغا ’’نظم جدید کی کروٹیں‘‘)

’’وارفتگی‘‘ کی وضاحت کرتے ہوئے آغا سلمان باقر نے لکھا ہے:

’’حقائق کی روشنی میں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آزاد کا یہ عالم جنوں یا پاگل پن نہیں تھا بلکہ ذہن کی ایک ایسی ماورائی کیفیت کا وہ مقام تھا جہاں دنیا کے مادّی نظریات دم توڑ دیتے ہیں اور زندگی کا مقصد اور روحانی نظریات عملی طور پر ذہن میں اپنی کیفیات مرتب کرنا شروع کر دیتے ہیں۔۔۔‘‘

ظاہر ہے کہ آزاد کے انہاک کو کئی طرح سے پڑھا جا سکتا ہے۔ ہر چند کہ جنوں میں میرے حساب سے کوئی عیب یا سامانِ رسوائی نہیں لیکن وارفتگی کا یہ لفظ بھی مفید معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے سے سرشاری و جولانی یا mood swing کی اس کیفیت کا اندازہ ہو سکتا ہے جو آزاد کی

بعض تصانیف میں بھی نظر آتی ہے۔ آپ اسے کوئی بھی نام نہ دے لیں، جنوں کا نام چاہے خرد رکھ دیں، یہ اپنی تفہیم کے لیے اپنی شرائط سامنے لے کر آتی ہے اور ہم اس کا مطالعہ اس انداز سے نہیں کر سکتے جس طرح روا روی میں ممکن ہوتا ہے۔ وارفتگی کی لہر ان کی معروف کتابوں میں بھی سامنے آتی ہے اور ان کے اسلوب نثر کا جزو خاص ٹھہرتی ہے تو کیا اس طرح ہم جنوں کو بھی آزاد کی شخصیت کا ایک رُخ سمجھ لیں جس کی تکمیل آہستہ آہستہ ہوتی رہی اور ایک وقت آنے پر باقی عناصر پر غالب آ گئی۔ بہر حال، اسباب و علل جو بھی رہے ہوں، آزاد کی اس کیفیت نے جن تصانیف کو جنم دیا وہ ایک آزاد مطالعے کی مستحق ہیں اور ان کو نہ تو رسمی و روائتی سانچوں میں ٹھونسا جا سکتا ہے اور نہ ہی ان سے سرسری گزرا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے سب سے پہلے تو ہمیں تعصب کی عینک اُتارنا ہوگی اور آزاد کی زندگی کے بارے میں سوانحی معلومات یا نفسیاتی و سماجی تاویلات کو قائم بالذات نہیں بلکہ محض ایک ذریعہ سمجھ کر ان کتابوں کو ادب کے طور پر پڑھنا ہوگا اور اسی اعتبار سے ان کا تعینِ قدر کرنا ہوگا۔ جس کی بابت اس مقالے میں ابتدائی گفتگو کی گئی ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آزاد کی سوانحی تفصیلات کے بارے میں ہمارے علم میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہوا لیکن سائیکاٹری کے علم میں روز افزوں ترقی کی بدولت اب یہ بات خارج از امکان نہیں کہ ایک ابتدائی حالت کے طور پر ہم آزاد کی مرضیاتِ نفسی کو پہچان سکیں۔ سائیکاٹری میں DSM-III اور پھر DSM-IV جیسے درجے بندی کے نظام تشکیل میں آ چکے ہیں جو علامات مرضی کی ترتیب سے مرض کی نشان دہی کرنے میں مدد دے سکتے ہیں۔ آزاد کے ضمن میں ان کے دوستوں، شاگردوں کے رقم کردہ احوال سے کسی مفصل میڈیکل رپورٹ کی غیر موجودگی میں مدد لی جا سکتی ہے اور پھر فیصلہ کن نتیجے پر پہنچنے کے لیے ان کی تحریریں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ ان بیانات کو DSM-IV کے سامنے رکھ کر ترتیب دینے سے آزاد کی تشخیص ممکن ہو سکتی ہے۔

کسی بھی نتیجے پر پہنچنے کے ساتھ ساتھ اس طریقہ کار کی محدودات کا اندازہ بھی لگا لینا چاہیے۔ خاص طور پر گورڈن کلیرج (Gordan Claridge) کی تحقیق کی روشنی میں۔ کلیرج نے دس ایسے ادیبوں کا خصوصی جائزہ لیا جنھوں نے اپنی ذہنی بیماری کے بارے میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے — مارجری کیمپ، تھامس ہوکلیف، کرسٹوفر اسمارٹ، ولیم کاؤپر، جان کلیر، جان رسکن، آرتھر بین سن، ورجینیا ولف، انتونیا وائٹ اور سلویا پلاتھ۔ (نفسیاتی خلل اور تخلیقی قوت کے درمیان

گہرے تعلق کے اس جائزے تک رسائی کے لیے میں رچرڈ بینٹل کی کتاب Madness Explained کا سپاس گزار ہوں جہاں سے مجھے اس کا حوالہ حاصل ہوا۔) کلیرج نے اپنے تجزیے کی تفصیل لکھی ہے کہ ان ادیبوں کے بیان کردہ علامات جب opcrit کے کمپیوٹر تشخیصی پروگرام میں کوڈ کی گئیں تو زیادہ تر معاملات میں تشخیص اسکیزوفرینیا کی ہوئی لیکن کئی ایک جگہ bi-polar disorder بھی نکل کر آیا۔ کئی ادیب ایسے تھے جن میں بیک وقت دونوں ہی بیماریوں کی تشخیص ہوئی اور اس بات کا انحصار اس امر پر تھا کہ کس طرح کی درجہ بندی اور معیار کا استعمال کیا گیا۔ آخری تجزیے میں، مجھے آزاد کا معاملہ بھی اسی طرح کا نظر آتا ہے اور ان کی تشخیص دونوں میں سے ایک مرض کے حساب سے کی جاسکتی ہے۔

رچرڈ بینٹل نے اپنی محولہ بالا کتاب میں کئی بار اس مشکل کا ذکر کیا ہے جو روائتی اندازے کے مطابق dementia precox اور manic depression کے درمیان تفریق کرنے میں پیش آتی ہے۔ آزاد کے مطالعے میں بھی یہی مشکل آڑے آتی ہے اور اس معاملے کی مزید چھان پھٹک کی ضرورت ہے کہ جنون کے حوالے سے آزاد کو اور آزاد کے حوالے سے جنون کو بہتر سمجھ سکیں۔

اسلوب کی چاشنی اور ادبی دل کشی کے باوجود تحریر جہاں اپنے مصنف کے ذہنی مرض کی تشخیص میں گواہ کی طرح شامل ہوجائے، محمد حسین آزاد بھی ادبی دنیا کے ان چند ادیبوں کی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں جن کی ''تحریرِ جنوں'' Schizophrmic writing جنوں آثار کے باوجود ادبی خصوصیات سے مبرا نہیں ہیں اور اپنی جانب توجہ مبذول کرتی ہیں۔ کسی نہ کسی حد تک آزاد سے مماثل ان میں سے بعض ادیبوں کا تذکرہ یہاں بے سود نہ ہوگا جن کے تناظر سے آزاد کی ان تحریروں کی تفسیر و تعبیر میں کسی قدر مدد مل سکے۔

تاریخی اعتبار سے پہلا اہم نام جو مجھے اس ضمن میں یاد آتا ہے، وہ کرسٹوفر اسمارٹ کا ہے۔ روحانیت کا شدید غلبہ اٹھارویں صدی کے اس شاعر کی دیوانگی کی نشانی ٹھہرا۔ چناں ڈاکٹر جانسن نے لکھا کہ میرا بے چارہ دوست اپنے دماغ کے خلل کا مظاہرہ کرتے ہوئے سڑک پر دوزانو ہوجاتا اور حمد و ثنا میں مشغول ہوجاتا۔ براؤننگ جیسے شاعر نے اس نابغۂ روزگار کو یوں خراجِ تحسین پیش کیا جو اس کی کتاب کے اشتہار میں بھی درج کیا گیا ہے:

"(he) pierced the screen

Twixt thing and word, lit language straight from soul..."

قرض داروں کی عقوبت گاہوں اور پاگل خانوں میں برسوں پر محیط عرصے میں وہ برابر نظمیں لکھتا رہا جن کی بنیاد پر انگریزی ادبیات کے نقاد اسے اٹھارویں صدی کے اہم ترین شاعروں میں سے ایک قرار دیا ہے۔ اسمارٹ کے شعری وژن کو اس کے religious mania سے مکمل طور پر علیحدہ نہیں کیا جاسکتا حالاں کہ بعض نقادوں نے اسمارٹ کی فکر میں تھیولوجی کو خاص طور پر تحقیق و تنقید کا موضوع بنایا ہے۔ بعض معاملات میں وہ اپنے بعد آنے والے اور پیغمبرانہ شان کے حامل شاعر رابرٹ بلیک کے قریب پہنچا ہوا معلوم ہوتا ہے حالاں کہ بلیک کی ذہنی حالت کو نفسیات کے مطابق کوئی نام دینا زیادہ مشکل کام ہے۔ فرانسیسی شاعر نرول Gerard de Nerval کا بھی یہاں نام لیا جاسکتا ہے۔ نثر نگاروں میں زیادہ اہم نام جرمن ادیب رابرٹ والزر (۱۸۵۷ء تا ۱۹۵۶ئ) کا ہے جس کے چند ناولوں اور افسانوں کی بدولت سوزن سونٹیگ جیسی نقاد اسے بیسویں صدی کے اہم ترین جرمن ادیبوں میں سے ایک قرار دیتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ والزر کے مختصر افسانوں، حکایتوں، تمثیلچوں کی فضا و اسلوب میں کافکا کے خاص انداز کی پیش روی ملتی ہے۔ کافکا اس ادیب کا معترف بھی تھا اور اس کی بعض ابتدائی تحریروں پر نقادوں کو والزر کا نام یاد بھی آیا۔ والزر کی ابتدائی تحریروں کو اختصار و سادگی پر، جو ظاہری طور پر غیر ادبی معلوم ہوتی تھی، رائے زنی کرتے ہوئے اس کے انگریزی مترجم کرسٹوفر مڈلٹن نے اسے اس عہد کے تاریخی ارتقاء کی ایک اہم کڑی کے طور پر دیکھا ہے اور ایک عجیب بات لکھی ہے:

"what name should be given to this kind of intensity? when a new mode of imagining erupts into literature, it dislocates the rhetonic if its time, and is of subtler stuff than that rhetonic—"the infinite amires barefoot on this earth," says Hans Arp.

(مڈلٹن، دیباچہ ’’ژاکوب فان گنٹن‘‘)

کئی کتابوں کی اشاعت کے بعد والزر کے مزاج میں شوریدگی بڑھتی گئی۔ یہاں تک ۱۹۲۹ء میں وہ ازخود نفسیاتی مریضوں کی علاج گاہ میں داخل ہوگیا۔ دیوانگی کی مہر تصدیق ثبت ہوجانے کے بعد، آزاد کے برخلاف، اس کا لکھنا یکسر موقوف ہوگیا اور اس کے ایک دوست نے اس کی گفتگو سے یہ فقرہ نقل کیا ہے کہ ’’میں یہاں لکھنے کے لیے نہیں بلکہ پاگل ہونے کے لیے آیا ہوں۔‘‘ (I'm (not here to write, but to be mad.

آخر ہم یہاں کس لیے آئے ہیں؟ لکھنے کے لیے یا پاگل ہونے کے لیے؟ آزاد کے نزدیک شاید یہ سوال ہی نہ اٹھتا کیونکہ وہ دونوں حالتوں میں تفریق نہ کرتے۔ یہ تفریق شاید اینا کیون (Anna Kavan) بھی نہ کرتی (۱۹۰۱ء تا ۱۹۰۱ئ) جو ذہنی بیماری کے باوجود (یا باوصف) لکھتی رہی اور بعض مبصرین نے اسے ورجینیا ولف کے بعد ابھرنے والی خواتین ناول نگاروں میں نمایاں ٹھہرایا۔ کیون کی مشکلات میں ذہنی بیماری کے پیچاک کے علاوہ ہیروئن کی لت بھی شامل تھی، اور غالباً یہی اس کے ناول ’’Ice‘‘ کے اچھوتے پن کا موجب بھی بنی ہو۔ اینا کیون کی ایک تحریر کا اردو میں ترجمہ کرتے ہوئے محمد سلیم الرحمن نے اس بارے میں مختصر مگر جامع انداز میں لکھا ہے:

> ’’اینا پر گہری بے کیفی طاری رہتی تھی۔ اس وقت کے طبی حلقے اس طرح کی بے کیفی یا ڈپریشن کو بیماری تصور نہ کرتے تھے۔۔۔ بار بار ذہنی امراض میں مبتلا رہنے سے اس کے جینے اور لکھنے کے اسلوب دونوں ہی بدل گئے۔ ہم اس کے فکشن میں ایسے فرد کے کرب سے دوچار ہوتے ہیں جو مسلسل تشویش، تجسس اور تنہائی کے نرغ میں ہے اور اپنی شناخت کے بارے میں متذبذب ہے۔ ان سلسلہ وار واہموں کو تراش خراش کر فکشن میں ڈھالنا، یہی اینا کیون کا کمال ہے۔۔۔‘‘

رابرٹ والزر سے کہیں زیادہ وقیع مطالعہ سوزن سونٹیگ نے فرانسیسی شاعر اور ڈرامہ نگار اینٹونن آرتو (Antonin Artaud) کا کیا ہے (۱۸۹۶ء تا ۱۹۴۸ئ) جسے وہ ’’ادبی جدیدیت کے سورمائی دور کی آخری عظیم مثالوں میں سے ایک‘‘ قرار دیتی ہے۔ آرتو جیسے ادیب کے لیے مختصر طور پر کچھ کہنا میرے لیے ممکن نہیں تاہم مختلف اصناف اور متفرق اسالیب میں اس کی تحریروں میں اس کی ذاتی اذیت نمایاں ہے اور وہ بقولِ خود، اپنے شعور سے اپنی بڑھتی ہوئی مغائرت کو اس طرح موضوع بناتا ہے کہ سونٹیگ کے مطابق، کسی دوسرے شخص نے ذہنی درد کے مائیکرو اسٹرکچر کا ایسا ان تھک اور مفصل رکارڈ نہ رکھا ہوگا۔ موضوع کی نشان دہی کے باوجود اس سے آرتو کی فکری و نظریاتی اہمیت واضح نہیں ہوتی اور نہ اندازہ ہوتا ہے کہ سرئیلزم سے لے کر اپنے عہد کے ادبی آواں گارد کا

یہ مبلغ مابعد جدیدیت کے لیے اتنا کلیدی ادیب کیوں ٹھہرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آرتو کے ''کیس'' نے مشیل فوکو کی اہم کتاب Madness and Civilization کے نظریاتی اساس فراہم کیا اور جدید سماج کے تجزیے کے لیے گائلز ڈیلیوزی Gilles Deleuze اور فیلکس Felix Guattan بھی بروئے کار لاسکے۔ وان گو کے بارے میں لکھتے ہوئے آرتو نے شکایت کی تھی کہ معاشرہ اسے ٹاٹ باہر کرنے کے لیے خودکشی کرتا ہے ("Suicided by society") لیکن اس کے باوجود وہ جدیدادب کے لیے اس طرح ایک کلیدی شخصیت قرار دیا جاتا رہا ہے جس کا خواب بھی آزاد کے ناقدین نہیں دیکھ سکتے۔ اس لیے کہ آزاد کی یہ تحریریں محفوظ رکھے جانے، شائع کیے جانے اور بالکل ابتدائی و بنیادی تجزیے کے عمل سے گزرنے سے بھی محروم رہیں۔ ہم ہوش مندوں کو نظرانداز کرنا جانتے ہیں، دیوانہ تو پھر دیوانہ ہے چاہے وہ دیوانہ محمد حسین آزاد جیسا نابغہ ہی کیوں نہ ہو۔

اوپر جن مغربی ادیبوں کے حوالے دیے گئے، ان کے برخلاف آزاد کے آخری دور کی ان تحریروں سے اغماض اور بے توجہی عام ہے۔ نقادوں نے انہیں درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھا، تجزیہ اور تفہیم تو دور کی بات۔ اس ضمن میں سب سے زیادہ افسوس ناک رائے آزاد کی سوانح نگار ڈاکٹر محمد صادق کی ہے۔ ''آزاد کا عالم دیوانگی'' نامی مضمون میں ان تحریروں کی وجۂ تسمیہ آزاد کی ''تحریر کی عادت کو راسخ'' ہوجانے کو قرار دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''میں نے مولانا کی ان تحریروں کو دیکھا ہے۔ نہایت خوبصورت خط میں لکھی ہوئی ہیں لیکن محض الفاظ کا ڈھیر ہے، نہ ربط ہے نہ معنی۔۔۔''

(''آبِ حیات کی حمایت میں اور دوسرے مضامین، لاہور، ۱۹۷۳ء)

نقاد کی رائے اتنی اٹل اور فیصلہ کن ہو تو اس کے بعد تنقیدی مکالمے کا دروازہ بند ہوجاتا ہے اور اس میں کسی ترمیم یا اضافے کی گنجائش تلاشِ بے سود۔ جہاں معنی فوری طور پر دستیاب یا سطح پر بکھرے ہوئے نہ ہوں اور ربط، متعین شدہ اصناف کی خارجی و ظاہری ترتیب سے علیحدہ داخلی ربط کی شکل میں نمودار ہوا ہو، جنون کا عطا کردہ غیرمنطقی ربط ہی سہی، وہاں ان عناصر کی موجودگی سے صریح انکار، تجزیے کے منصب کی ادائیگی سے بچ نکلنے کا سہل ترین راستہ بن جاتا ہے۔ ربط و معنی کی ظاہری شکلوں سے اجتناب کے باوجود ان تحریروں میں ایک عنصر کی موجودگی سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا اور وہ ہے آزاد کا نثری اسلوب۔ میری ناچیز رائے میں صرف یہی ایک عنصر ان تحریروں کی اہمیت کے لیے کافی ہونا چاہیے۔

خارجی شواہد کے مطابق، زبان پر عبور نے اس عالم میں بھی آزاد کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا اور اس کا اندازہ ان کے قریبی دوستوں کو بھی تھا، چاہے وہ اس کے recieving end پر ہی کیوں نہ ہوں۔ مولوی عبدالرزاق کانپوری نے اس کیفیت کا ایک دل چسپ مرقع کھینچا ہے جو اس ضمن میں توجہ کے لائق ہے۔

> ”جب لاہور میں ایجوکیشنل کانفرنس کا پہلا اجلاس ہوا اور شمس العلما نذیر احمد بھی شریک ہوئے تو آزاد بھی مہمان خانے میں اپنے ہم مکتب دوست سے ملاقات کو تشریف لائے۔ بچپن کے یار تھے اور خدا جانے کس مدت میں ملے تھے، اس لیے دیر تک گفتگو ہوئی۔ کبھی سلجھی ہوئی اور کبھی الجھی ہوئی، یہ خللِ دماغ کا نتیجہ تھا۔
>
> اسی اثنا میں مولانا نذیر احمد نے از راہ کسر نفسی فرمایا کہ ”سرسید کی فرمائش سے کانفرنس میں میرا بھی ایک لکچر ہوگا۔ اگر آپ ایک نظر ملاحظہ فرمالیں تو مجھے اطمینان ہوجائے، یہ سنتے ہی کہا کہ وہ لکچر کہاں ہے؟ مولانا نے پیش کیا اور آزاد نے اسی جگہ دیکھنا شروع کیا اور ایک گھنٹہ کے اندر پورا لکچر دیکھ لیا۔ کوئی صفحہ ایسا نہ تھا جو اصلاح و ترمیم سے باقی رہا ہو، اخیر میں فرمایا۔ بھئی نذیر تم اردو لکھنا بھول گئے ہو، اس کے بعد اٹھے اور چلے گئے، یہ گویا ایک آندھی تھی جو آئی اور ہوا ہوگئی۔“

آزاد کے عالمِ جنوں کی تصانیف میں کسی اعتبار سے یکسانیت نہیں ہے کہ ان کو ایک ہی طرح کے متن قرار دیا جاسکے، زبان کے اعتبار سے نہ انشا کے مطاب۔ اپنی تحریر کے دوران کی عمومی کیفیت کے ساتھ ساتھ اور آزاد کی مجموعی ذہنی صورتِ حال اور بیماری کے زور و زوال کے ساتھ ساتھ اسلوب و بیان میں آنے والی تبدیلیوں کی غمازی ہوتی رہتی ہے۔ زبان خلط ملط بھی ہوتی ہے بدلتی بھی ہے، اسی طرح صنف بھی کچھ سے کچھ ہوجاتی ہے۔ اس امر پر چنداں تعجب نہ ہونا چاہیے کہ ان تحریروں میں نثر کے غالب حصے کے ساتھ ساتھ نظم بھی شامل ہے۔ ”خم کدۂ آزاد“ کے مؤلف آغا محمد طاہر (نبیرۂ آزاد) اپنی تالیف کے دیباچے میں آزاد کی شاعری کے مختلف ادوار کی نشان دہی کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

”اس کے بعد حضرت آزاد کی شاعری کا آخری دور ہے کہ شعر و سخن کا تیراک ۱۸۸۷ء کے

قریب دریائے حیرت میں ڈوب گیا۔ دیکھنے والے کہتے تھے مولانا مجذوب ہوگئے۔ اچھا یوں ہی سہی۔

حیرتِ جلوہ گری مُہرِ لب خاموش ہے
آنکھ محوِ دید تھی اتنا مجھے بھی ہوش ہے

اس جذب کے زمانے میں ایک خاص کیفیت طاری ہوئی۔ مزاج اپنی پچاس سالہ گزشتہ کیفیت پر اُتر آیا۔ طبیعت غزل پر دوبارہ آمادہ ہوگئی۔ فرق فقط اتنا ہی تھا کہ جوانی کی شاعری مطلوبِ خیالی کی تصویر تھی۔ یہاں حقیقت جلوہ نما ہوگئی۔ حیرت خود حیران تھی کہ آزاد کا بڑھاپا اور غزل کی جوائِ طبیعت جوش وخروش دکھاتی جذباتی اور ولولہ انگڑائیاں لیتے ہوئے اٹھتے اورلڑکھڑاتے ہوئے چلتے، اس زمانے میں مولانا بے باکانہ غزلیں لکھتے تھے، مستانہ انداز میں ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے، شاہدِ حقیقی ہر وقت سامنے تھا۔ جوششِ جنوں میں سر بصحرا نکل کھڑے ہوتے۔۔۔''

یہ غزلیں ''خم کدۂ آزاد'' میں شامل ہیں لیکن اس نشان دہی کے بغیر کہ خاص اس دور اور اس مذکورہ کیفیت کا کلام کون سا ہے۔ آزاد کی اس جولانیِ طبع اور بڑھاپے کی رنگین غزل سرائی کا ایک تقابلی جائزہ ان کے قریبی ہم عصر شبلی نعمانی کی غزل سرائی کے ساتھ کیا جاسکتا ہے جو اپنے تبحر علمی کے ساتھ خاص وارداتِ قلبی کے بعد اس طرف رجوع ہوئے۔ محرکات ضرور مختلف ہیں مگر دونوں ادیبوں نے سہارا غزل کا تلاش کیا۔

ان غزلوں پر تو نہیں مگر صرف ایک نظم کے ساتھ آغا محمد طاہر نے تصنیف کے وقت کا تعین کیا ہے۔ اس مجموعے کا آغاز جس حمد سے ہوتا ہے، اس پر فٹ نوٹ میں درج ہے:

''یہ موتی عالم جذب کے رشتے میں نظم ہوئے ہیں کہ لفظ لفظ وارفتگیِ طبیعت کا ایک عالم ہے۔ حضرت آزاد کو اپنی عمر میں یہی زمانہ سب سے زیادہ محبوب تھا۔ اس لیے اسی کو سرنامہ کرتا ہوں۔۔۔''

نظم عالمِ جذب کی عکاسی بھی ہے اور اپنے آپ میں ایسی کیفیت کے ساتھ مکمل جو آزاد کی شاعری میں بالعموم نظر نہیں آتی۔ اس لیے ان کے اس دور کی تصانیف میں بھی الگ معلوم ہوتی ہے۔ آزاد کی شاعری پر عموماً کم ہی لکھا گیا ہے، لیکن جو لکھا گیا ہے اس میں بھی اس نظم کا ذکر نہیں

ملتا اور نہ اس کا ذکر مجھے عالمِ جنوں کا تذکرہ کرنے والے سوانح نگاروں اور تجزیہ نگاروں کے یہاں ملتا ہے۔

آزاد جنوں کے بطون میں اُتر کر ہوش و خرد چاہے گم کر بیٹھے ہوں مگر وہ ایک چیز نہیں بھولے، اور وہ ہے اردو لکھنا۔ ان کے اسلوب کا یہی جادو ہے جو اس دور کی بعض کتابوں کو ان کے تصنیفی سرمائے کا ایسا حصہ بنا دیتا ہے جس سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا۔ ''جانورستان'' مختصر کتاب ہے اور آزاد کی مرتب کردہ درسی کتابوں کا ایک اُلٹا ہوا نقشہ (Converse) جہاں وہ اپنے اسلوب کی نہیں، اس جہانِ مرغ و ماہی کی ایک تُند خو پیروڈی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس متن میں باز کا بیان ہو یا مرغ کا، آزاد کا پُرلطف اسلوب آخر تک ساتھ نہیں چھوڑتا۔ آزاد کے اسی اسلوب کی ادبیت، لسانی و نفسیاتی ہی نہیں، ادبی مطالعے کی مستحق ہے۔

ذہنی حالت میں روز بروز بڑھتے ہوئے انتشار کے باوجود تحریر کے طبیعی عمل سے آزاد کے انہماک اور کتاب تیار کرنے کے سلسلے میں تندہی میں ظاہری طور پر کوئی کمی نہیں آئی۔ چناں ڈاکٹر اسلم فرخی لکھتے ہیں:

> ''آزاد کے یہ مسودے آج کے مصنفوں کے لیے شمعِ ہدایت ہیں، آزاد نے ہر کتاب کو نہایت خوش خط اور دیدہ زیب انداز میں لکھا ہے تمام اعلام سرخ روشنائی اور جلی قلم سے لکھے گئے ہیں، کانٹ چھانٹ بالکل نہیں ہے، سارے مسودے مجلد ہیں اور جلد کی پیشانی پر کتاب کا نام لکھا ہوا ہے۔ مزید احتیاط کے طور پر جلد کے اندر بھی نام لکھ دیا گیا ہے، سطروں میں کوئی بے ترتیبی نہیں بلکہ پہلے پنسل سے لکیریں کی گئی ہیں اس کے بعد لکھائی شروع کی گئی ہے، کہیں کہیں حاشیے پر وضاحتی اشارے بھی ملتے ہیں، ان مسودوں کو دیکھ کر کوئی بھی شخص یہ اندازہ نہیں کرسکتا کہ یہ عالمِ جنوں کی یادگار ہیں، البتہ چند صفحے پڑھ لینے کے بعد یہ یقین پُختہ ہوجاتا ہے۔۔۔''

مسودوں کی مزید تفصیل آغا سلمان باقر نے بھی لکھی ہے، جن کے پاس اب یہ سارے قلمی آثار موجود ہیں۔ ان بیانات سے یہ اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں کہ بگڑتی ہوئی ذہنی حالت کے باوجود آزاد لکھنے کے عمل کو شعوری طور پر (جس حد تک ان پر اس لفظ کا اطلاق کیا جاسکتا ہے) اختیار کیے ہوئے تھے۔ ان کی یہ تصانیف حادثاتی یا واقعاتی نہ تھیں بلکہ کتاب تیار کرنے کے عمل کا اسی

طرح سے نتیجہ جیسے کہ ''آب حیات'' اور دوسری باضابطہ کتابیں۔ ان کی تیاری میں مصنف کا وہی اہتمام کارفرما نظر آتا ہے، اگرچہ معنویت بتدریج کم ہوتے ہوئے بڑی حد تک داخلی ہوکر رہ جاتی ہے۔ اس بیان سے یہ بھی انداز ہوتا ہے کہ مصنف یہاں بھی معزول شدہ دیوتا نہیں، اپنی پوری حیثیت میں براجمان ہے۔ ان تحریروں کو اضطراری عمل کا اظہار یا الٹی سیدھی doodles کسی طرح نہیں سمجھا جاسکتا۔ زبان کی طاقت اور بیان کے اصول بھی اتنی آسانی کے ساتھ اسے چھوڑ نہیں دیتے۔ بلکہ ان تحریروں میں بعض ایسی ادبی خوبیاں بھی نظر آتی ہیں جو آزاد کے پہلے دور کی تصانیف کا خاصہ ہے۔ اپنی کتاب کی دوسری جلد میں آزاد کی تمام تصانیف کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر اسلم فرخی نے ''عالم جنون کی تصانیف'' کے لیے ایک باب قائم کیا ہے اور اس میں ''مکاشفاتِ آزاد'' کا ایک اقتباس بھی درج کیا ہے، جسے وہ آزاد کے ''مطلعِ بےخودی کی پہلی کرن'' قرار دیتے ہیں۔ اس اقتباس کا موضوع ''عمل شیرگانی، اس کے لوازمات، احتیاط اور روایات'' ہیں حالاں کہ یہ کہیں واضح نہیں ہوتا کہ آزاد کے بیانیے کے باہر بھی ان کا کوئی وجود ہے۔ اس اقتباس کو درج کرنے کے بعد ڈاکٹر اسلم فرخی نے لکھا ہے:

> ''اس طولانی بیان سے بے ربطی افکار یا دیوانگی کا احساس نہیں ہوتا۔ اس بیان کو مجذوب کی بڑ کہہ کر ٹالا نہیں جاسکتا۔ اس میں تسلسل، نظم و ضبط، توازن اور مسائل بہ عمل ذہنی کیفیت کی بڑی کامیاب تشریح ملتی ہے۔ اس بیان سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ آزاد کے جنون کو عملیات سے بھی کچھ نہ کچھ تعلق ضرور تھا۔ مکاشفات میں یہی سنبھلی ہوئی کیفیت ہر جگہ نمایاں ہے۔ عمل کی احتیاطیں بیان کی گئی ہیں۔ منہیات کا بیان ہے اور وارداتِ ذاتی کی تشریح میں آزاد تخیل حقیقت کے روپ میں نمودار ہوئی ہے۔ اس میں وضاحت کا عنصر زیادہ نمایاں ہے۔۔۔''

ڈاکٹر صاحب کے نزدیک ''مکاشفات'' آزاد کے پختہ اسلوب کو نمایاں کرتی ہے اور ان کی دیوانگی کے سبب کو نمایاں کرتی ہے جب کہ بعد کی کتابیں، اس کی شدت اور گوناگوں کیفیات سے عبارت ہیں۔ اس طرح دیوانگی کی تمام تصانیت کو ایک ہی معیار سے جانچنے کے بجائے ان کی درجہ بندی بھی کی جاسکتی ہے اور دیوانگی کے مظاہر کا مطالعہ بھی، جو ادبی اہمیت سے سراسر مختلف نوع کی چیز ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ آزاد کی یہ تحریریں، مختلف النوع سطحوں پر مطالعے کا موضوع بن سکتی ہیں۔ ''مکاشفات'' کے بارے میں خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ داخلی شہادتوں کے مطابق ۱۸۸۵ء کی

تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ یعنی جنون کے آثار نمایاں و پختہ ہونے کے بعد کی۔ ۱۹۰۳ء میں مولوی ممتاز علی نے لاہور سے شائع کیا۔ اس دور کی تصانیف میں سے اس کے بعد ''سپاک و نماک'' (سال تصنیف ۱۸۹۵ئ، اشاعت ۱۸۹۷ئ) فلسفۂ الٰہیات (۱۸۹۶ء کی تصنیف، اشاعت ۱۹۲۶ئ) اور ''جانورستان'' (سال تصنیف نامعلوم، اشاعت ۱۹۲۸ئ) مطبوعہ کتب میں شامل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ان مطبوعہ کتب کی تفصیلات بیان کی ہیں اور لکھا ہے کہ ''باقی کے مسودے محفوظ ہیں۔'' اسی کتاب میں وہ وضاحت کر چکے ہیں کہ غیر مطبوعہ کتابوں کے مسودے جن میں ساری کتابیں عالم دیوانگی کی نہیں تھیں بلکہ کچھ ابتدائی اور نامکمل مسودے اور دو ایک تکمیل شدہ کتابیں بھی تھیں، آزاد کے اہل خاندان، خاص طور پر ڈاکٹر محمد باقر کی تحویل میں تھیں۔

عالم جنون کی تصانیف کی فہرست تیار کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے باون ایسی کتابوں کی نشان دہی کی ہے جن کا نام موجود ہے۔ ان کے صفحات کی تعداد، تحریر کی زبان اور کسی حد تک موضوع کا تعین بھی ہوسکتا ہے۔ ان میں ستاسی صفحات کی اور اردو، عربی میں لکھی جانے والی ''شگفت'' سے لے کر عربی میں لکھی جانے والی اور محض دو صفحات پر مشتمل ''المتاب'' شامل ہیں۔ ان باون کتابوں کے علاوہ ۳۷ ایسے مسودے ہیں جن پر کتاب کا کوئی نام درج نہیں ہے اور جن کے بارے میں مزید کوئی تفصیل درج نہیں کی گئی۔ ڈاکٹر صاحب کے تخمینے کے مطابق ''اس طرح عالم جنون کی غیر مطبوعہ تصانیف کی تعداد نواسی (۸۹) ہوجاتی ہے۔۔۔''

مسودوں کی یہ تعداد کسی طرح معمولی نہیں۔ ان کتابوں کی ترتیب و تجزیے کو ڈاکٹر صاحب ''ایک اہم ادبی خدمت'' قرار دیتے ہیں اور آزاد کے مطالعے کا نقطۂ تکمیل بھی۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس کی نوبت نہ آسکی اور شاید کبھی نہ آسکے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ نواسی مسودے اپنی آنکھ سے دیکھنے کا حوالہ دیا ہے۔ یہ ان مسودوں کی آخری خبر ہے۔ اس کے بعد ان کا کیا بنا، یہ کسی کو معلوم نہیں۔ آزاد نے یہ تصانیف ۱۸۸۵ء سے لے کر ۱۹۱۰ء کے درمیان لکھیں۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نے ان کو ۶۳۔ ۱۹۶۴ء کے لگ بھگ دیکھا۔ یعنی تصنیف کے تقریباً نصف صدی بعد۔ اس پورے عرصے میں یہ مسودے محفوظ رہے اور اس قابل بھی کہ ادب کا طالب علم ان کو پڑھ سکے، ان کا جائزہ لے سکے۔ ان کتابوں کے اس آخری مطالعے کو بھی اب تقریباً نصف صدی ہونے کو آرہی ہے۔ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ اب کوئی طالب علم ان مسودوں کو دیکھ سکتا ہے نہ پڑھ سکتا ہے۔ نہ ان کا کچھ اتہ پتہ معلوم ہے کہ سیلِ زمانہ بہا کر کہاں لے گیا۔

میں نے ابھی جرمن ادیب رابرٹ والزر کا ذکر کیا تھا جس نے ذہنی اختلال کے باوجود ایک طویل عرصے تک لکھنے لکھانے کا عمل جاری رکھا۔ اس کی شائع شدہ کتابوں کے بعد محقق حضرات نے اس سلسلۂ مطبوعات کو آگے بڑھایا۔ اس کے انگریز مترجم کرسٹوفر مڈلٹن نے محقق Jochen Greven کے "painstaking editorial work" کا ذکر کیا ہے جس نے ان آٹھ سو نثر پاروں اور مکالموں پر کام کیا جو والزر نے ایک خفیہ طرزِ تحریر میں، جو اس کا ایک قسم کا نجی شارٹ ہینڈ تھی، لکھ رکھے تھے۔ گریون کی محنتِ شاقہ کے نتیجے میں ان میں سے تین سو نثر پارے شائع شدہ تحریروں کی ابتدائی صورت ہیں اور باقی ماندہ ایسے کہ ان کو پڑھا نہیں جاسکتا، یا وہ مکمل نہیں ہیں۔ یعنی والزر کی تحریروں کو جس حد تک محفوظ رکھا جاسکتا تھا، ان کو نقل کر کے شائر کیا گیا۔ کرسٹوفر اسمارٹ کے مسودے بھی تحقیق کے اسی عمل سے گزرے اور محققوں کی ایک وپری جماعت، جس کے سربراہ Marcus Walsh اور Kerina Williamson ہیں، ان نظموں کو مرتب کر کے شائع کیا جن میں سے بعض fragments سے زیادہ نہیں تھیں۔ آرتو کی تمام تحریروں پر مشتمل ’’مکمل تصانیف‘‘ فرانس کا موقر ادارہ گالی مار Gallimard کئی جلدوں میں شائع کرتا رہا ہے۔ اردو کے نامور انشا پرداز محمد حسین آزاد اردو کے ہم نصیب بھی ہیں کہ ان کی غیر مطبوعہ تصانیف نشر و اشاعت کی فراوانی و سہولت کے اس زمانے میں شائع ہو کر سامنے نہ آسکیں اور اب بھی بڑی حد تک پردۂ اخفا میں ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ آرکائیوز کے قومی ذخیرے میں یا کسی علمی ادارے میں، جن کا لاہور میں فقدان نہیں ہے، محفوظ رکھے جاتے تاکہ ان پر تحقیق کی جاتی۔ اب ان کے بارے میں دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں یہ بھی غتربود نہ ہوجائیں۔ آزاد اگر اپنے ہوش و حواس سے آزاد ہوگئے تھے تو ہم جو ان کے عقیدت مند ہیں، عقل و جنوں کے دوراہے پر کس جانب تیزی کے ساتھ گامزن ہیں۔ مگر اس کی سمت نمائی سے بھی کیا فائدہ کہ ہم نے اپنے حال پر افسوس کرنا بھی چھوڑ دیا ہے۔